آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای کے بعض افکار کا تجزیاتی مطالعہ

مؤلف: ڈاکٹر محمد اسامہ

۱۹۲۵ء سے فروری ۱۹۷۹ء تک ایران پر حکومت کرنے والے لوگوں کا تعلق پہلوی خاندان سے تھا جس کو امام خمینیؒ کی قیادت میں عظیم الشان کامیابی حاصل کرنے والے اسلامی انقلاب نے صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ امام خمینیؒ اسلامی انقلاب کے بانی اور حقیقی رہنما تھے۔ اس تحریک میں جن عظیم علماء نے ان کا ساتھ دیا ان میں سے ایک نام حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای کا بھی ہے، جنھوں نے دین اسلام کی سربلندی اور امت مسلمہ کی ترقی میں یقیناً غیر معمولی کردار نبھایا ہے۔ رہبر معظم نے نہ صرف اپنے ارشادات و بیانات سے بلکہ تصانیف سے بھی دین اسلام کی خدمت کی ہے۔ زیر نظر مقالے میں آپ کے بعض افکار و نظریات کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

مختصر سوانح حیات

حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای شہر مشہد، ایران کے ایک مشہور اور دین دار گھرانے میں ۱۹/ اپریل ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا شجرۂ نسب سلطان العلماء المعروف بہ سلطان سید احمد تک پہنچتا ہے جو پانچ واسطوں سے امام سجادؑ کے بیٹے ہیں۔ موصوف کے خاندان نے دینی و علمی میدان میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ چنانچہ ان کے دادا محترم سید حسین خامنہ ای اور والد محترم سید جواد خامنہ ای کا شمار اپنے وقت کے جید علما اور مجتہدین میں ہوتا ہے۔

آیت اللہ خامنہ ای نے اپنی تعلیم کا آغاز چار سال کی عمر میں قرآن کریم سے کیا، البتہ باقاعدہ ابتدائی تعلیم مشہد کے قدیم اسکول دار التعلیم دیانتی میں حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے مدرسہ سلیمان خان اور مدرسہ نواب کا رخ کیا جہاں علم دین سیکھا۔ مزید اعلیٰ تعلیم کا شوق انہیں نجف اور قم کھینچ لایا۔ اس دوران ان کا زیادہ تر وقت تحقیق و مطالعہ اور درس و تدریس میں گزرا۔ ان کے مربی و اساتذہ کرام میں سید جلیل حسینی

سیستانی، مرزا احمد مدرس یزدی، آیت اللہ حاج شیخ ہاشم قزوینی، سید محمد ہادی میلانی، آیت اللہ سید محسن حکیم، سید ابو القاسم خوئی، سید محمود شاہرودی، آیت اللہ حاج آقا حسین بروجردی، امام خمینی اور علامہ طباطبائی جیسی عظیم شخصیات شامل ہیں۔

حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای کی زندگی کا ایک اہم پہلو ان کا ملک وملت کی سیاست میں بھرپور حصہ لینا ہے۔ اس کی تحریک انہیں مشہد میں سید مجتبیٰ نواب صفوی (میر لوحی) سے ملی، جس کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں:

"سید مجتبیٰ نواب صفوی سے ملاقات نے مجھ میں پہلی انقلابی چنگاری پیدا کی تھی۔"[1]

آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای کا شمار ان اولین افراد میں ہوتا ہے جنہوں نے ایران میں حضرت امام خمینیؒ کا نہ صرف بحسن وخوبی ساتھ دیا بلکہ اس سلسلے میں قید وبند کی صعوبتوں کے علاوہ خود پر قاتلانہ حملے بھی برداشت کئے۔ امام خمینیؒ نے ایک موقع پر ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے فرمایا:

"......میں عزیز خامنہ ای آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ محاذ جنگ پر فوجی لباس میں اور محاذ جنگ کے پیچھے علماء کے لباس میں اس مظلوم قوم کی خدمت کی اور اسلام و مسلمانوں کی خدمت جاری رکھنے کے لئے خداوند متعال سے آپ کی صحت وسلامتی کی دعا کرتا ہوں۔"[2]

اسلامی انقلاب کے روح رواں، امام خمینیؒ اپنے شاگرد و رفیق سید علی خامنہ ای کی مختلف صلاحیتوں سے اس قدر متاثر تھے کہ وہ انہیں اپنا جانشین سمجھتے تھے۔ اس حوالے سے امام خمینیؒ کی بیٹی زہرہ مصطفوی فرماتی ہیں:

"جب میں نے امام خمینیؒ سے نظام کے اگلے رہبر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے آیت اللہ خامنہ ای کا نام لیا اور جب آیت اللہ خامنہ ای کے علمی مقام ومرتبہ کے بارے

۱۔ مرکز اسناد، شمارہ ۱۲۲۶، بحوالہ راہ اسلام، خصوصی شمارہ، رہبر معظم آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ، حیات وارشادات، ایران کلچر ہاؤس، ۱۸ تلک مارگ نئی دہلی، شمارہ ۲۳۴۔۲۳۵، ستمبر ۲۰۱۵ء تا اگست ۲۰۱۶ء ص ۱۰

۲۔ صحیفۂ نور: ۵۰۴، ۱۴، بحوالہ راہ اسلام، ص ۵۰

میں پوچھا تو انہوں نے آیت اللہ خامنہ ای کے اجتہاد کی تائید کی۔"[۱]

موصوف کو تفسیر، قرائت و تجوید، فقہ واصول فقہ، شعر و ادب، ترجمہ وتالیف، سیاست، مغربی تہذیب وتمدن اور اصلاح امت سے خصوصی شغف رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زیادہ تر ان ہی موضوعات پر کتابیں، تقریریں، خطابات اور افکار ونظریات پیش کئے ہیں۔ ان کی مشہور ومعروف کتابوں/ترجموں میں چہار کتاب اصلی علم رجال، طرح کلی اندیشہ اسلامی در قرآن، پیشوای صادق، از ژرفای نماز، صبر، روح توحید نفی عبودیت غیر خدا، ترجمہ کتاب آیندہ در قلمرو اسلام تصنیف سید قطب، ترجمہ تفسیر فی ظلال القرآن اثر سید قطب، ترجمہ کتاب سہم مسلمانان در نہضت آزادی ہندوستان تصنیف عبد المنعم النمر، ترجمہ ادعانامہ علیہ تمدن غرب اثر سید قطب، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آیت اللہ خامنہ ای کے بعض افکار کا تجزیاتی مطالعہ

حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے مختلف موضوعات پر اپنے ارشادات وبیانات کے ساتھ ساتھ دینیات، سماجیات، عرفانیات، اقتصادیات اور سیاست وغیرہ کو بھی موضوع قلم بنایا ہے۔ یوں تو ان کی ان موضوعات پر بہت سی کتابیں ہیں لیکن ان میں سے ایک اہم کتاب "کلام رہنما" ہے جس میں انہوں نے تزکیۂ نفس، زہد و تقویٰ، اسلام کے ارکان، جہاد، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، صنف نازک کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں، قرآن کریم، دینی عوامی حکومت، اتحاد اسلامی، دین وسیاست، اسلامی تہذیب وثقافت، اسلامی بیداری، سماجی انصاف اور مسئلہ فلسطین وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اپنے افکار ونظریات پیش کئے ہیں۔

دراصل یہ کتاب علامہ موصوف کی فارسی تقریرات کا مجموعہ ہے جسے حجۃ الاسلام والمسلمین جناب علی خالق پور نے ترتیب دیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ حجۃ الاسلام جناب مولانا سید نذر امام نقوی نے کیا ہے اور نظر ثانی کا فریضہ حجۃ الاسلام جناب مولانا حیدر مہدی کریمی نے انجام دیا ہے۔ اسے پہلی بار ۲۰۱۵ میں ولایت فاؤنڈیشن، ۱۸ تلک مارگ، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ راقم الحروف کے پیش نظر یہی ایڈیشن ہے، جس کے تحت علامہ حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای کے بعض اہم افکار ونظریات کا تجزیہ پیش کرنے کی

۱۔ جمہوری اسلامی، شمارہ ۵۲ ۵۳، ص ۲، بحوالہ راہ اسلام، ص ۵۱

کوشش کی گئی ہے۔ طوالت کے پیش نظر مقالہ نگار نے صرف چار موضوع (جہاد، دین وسیاست، دینی عوامی حکومت، اسلامی تمدن وثقافت) پر بحث کی ہے، نیز ان موضوعات پر بعض دیگر علمائے کرام اور مفکرین کے نظریات بھی پیش کئے گئے ہیں۔

(الف) جہاد

موجودہ دور میں اسلام کے نظریۂ جہاد پر مخالفین کی جانب سے لگاتار اعتراضات کئے جارہے ہیں اور ان لوگوں نے دنیا کے سامنے اس کی تصویر کچھ اس طرح پیش کی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دہشت گردی اور قتل انسانیت کی سب سے اہم وجہ اسلام کا نظریہ جہاد ہی ہے یہی وجہ ہے کہ مسلم مفکرین اور علمائے کرام کی جانب سے برابر اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے بھی اس موضوع پر گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ جہاد سے مراد صرف ہتھیاروں سے ہی جنگ کرنا نہیں ہے بلکہ اپنے جائز مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے جدوجہد کرنا بھی جہاد ہے۔ اس حوالے سے آپ کہتے ہیں:

> "جہاد کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ تلوار اور بندوق کا ہی سہارا لیا جائے، آپ کی ہر کوشش ایک قسم کا جہاد ہے۔ جہاد یعنی سعی و کوشش بجالانا اور زندگی یعنی ہم اپنی ان کوششوں اور مقاصد کو مجسم کریں اور ان اقدار کو جو ہمارے لیے عزیز ومحترم ہیں، مشخص ومعین کریں، اس کے بعد پوری طاقت اور تندہی سے اس سلسلے میں کوشش کریں۔"[۱]

علامہ سید علی خامنہ ای درج بالا تعریف کی بنیاد پر جہاد کی مختلف قسمیں طے کرتے ہیں، جن میں سے بعض درج ذیل ہیں:

۱۔ رزمیہ جہاد ۲۔ سیاسی جہاد ۳۔ تعمیری جہاد ۴۔ ثقافتی وفکری جہاد ۵۔ نفسانی جہاد[۲]

۱۔ اسلامی جمہوریہ ایران کے ریڈیو ٹیلی ویژن کے اجتماعی وسماجی گروہ کے اراکین سے خطاب: ۱۸/فروری ۱۹۹۲ء
۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: کلام رہنما، علی خالق پور، ایران کلچر ہاؤس، ۱۸۔ تلاک مارگ نئی دہلی، بار اول، ۲۰۱۵، صفحات ۱۷۸۔۱۷۵

علامہ موصوف جہاد میں دو شرطوں/ارکان کا ہونا ضروری قرار دیتے ہیں جن کے بغیر جہاد نہیں ہوگا اور نہ ہی اس پر کوئی اجر وثواب ہوگا۔ اس سلسلے میں آپ فرماتے ہیں:

> "جہاد کی بنیاد دوارکان پر قائم ہے: ایک تو یہ ہے کہ اس میں جدوجہد اور جہد مسلسل ہو اور دوسرے یہ کہ دشمن سے مقابلہ کرنا ہو۔ اگر کوئی دوست کے خلاف جدوجہد کرے تو یہ جہاد نہیں بلکہ فتنہ اور رخنہ اندازی ہوگا۔ اگر حکومت حقہ اور نظام حق اور مصلحت حقہ کے خلاف جدوجہد اور سعی مسلسل انجام دے تو یہ فتنہ ومحاربہ ہوگا، جہاد نہیں کہلائے گا، لیکن اگر یہ سبھی چیزیں دشمن خدااور علی لسان اللہ ولسان رسولہ و اولیاء علیہم السلام کے دشمن کے خلاف ہو تو جہاد فی سبیل اللہ کہلائے گا۔[1]

علامہ سید علی خامنہ ای جہاد کے حوالے سے مسلمانوں کے ایک طبقۂ فکر پر جو جہاد کو صرف "دفاعی جہاد" تک محدود رکھتا ہے، تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ لوگ عیسائیوں کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول سے کہ "اگر کسی نے تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم دوسرا گال بھی پیش کردو" سے متاثر نظر آتے ہیں، نیز ان کے اس پروپگنڈے کا شکار ہیں کہ ہم تو بالکل ہی جنگ وجدال سے دور رہنے والے لوگ ہیں اور امن وسکون کے خواہاں ہیں جب کہ تم لوگ جنگ وجدال والے ہو اور قتل وغارت گری وخونریزی ہی تم لوگوں کا پیشہ ہے۔ البتہ علامہ موصوف نے اس میں کسی طبقے یا کسی مفکر اور عالم دین کا نام نہیں لیا ہے، بلکہ "مسلمان قلم کار" اور "مسلمان دانشور" جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> "عیسائیوں نے اس قدر اس کو (درج بالا قول کو) دہرایا کہ مسلمانوں کو (اپنے اس قول پر) قائل وقانع کردیا... اس کے بالمقابل مسلمان قلم کار اور دانش ور کہنے لگے کہ: ہم جہاد کے قائل نہیں اور یہ جو جہاد پایا جاتا ہے یہ ہمارا دفاع ہے۔"[2]

۱۔ فقہ کے درس خارج کے آغاز کے موقع پر بیان: ۱۱/ستمبر ۱۹۹۴

۲۔ کلام رہنما، علی خالق پور، ایران کلچر ہاؤس، ۱۸۔ تلک مارگ نئی دہلی، بار اول، ۲۰۱۵ء، صفحہ ۱۷۱

واضح رہے کہ مسلم علمائے کرام اور مفکرین کا ایک طبقہ "دفاعی جہاد" کا قائل ہے۔ اس فکر کے حاملین میں حضرت سفیان ثوری، ابن شبرمہ، امام اوزاعی، مولانا ابوالکلام آزاد، شیخ ابوزہرہ وغیرہ ہیں۔[۱]

علامہ سید علی خامنہ ای کے نظریۂ جہاد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "دفاعی جہاد" کے قائل نہیں ہیں، البتہ وہ اسے انسانی زندگی میں صلح وسکون کو ختم کرنے والوں، معاشرے میں بدامنی پھیلانے والوں اور انسانیت کے دشمنوں سے مقابلہ کرنے والوں کے لئے خاص کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

> "اسلام کا جہاد، عقیدہ مسلط کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ ایسے لوگوں سے مقابلہ کرنے کے لئے ہے جو انسانوں کو اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں۔ اسلام کا جہاد قوموں سے نہیں ہے بلکہ ستمگر اور ظالم طاقتوں سے ہے۔ یہ اسلام کی تاریخ ہے، یہ اسلامی رہنماؤں کی کارکردگی ہے اور یہ اسلامی ہدایتوں کی تاکید ونصیحت ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ کوئی ان سب چیزوں کو نہ سمجھے اور اسلامی جہاد کی جو کہ قوموں کے لئے حریت پسندانہ جدوجہد ہے اور قوموں کو ظالم وستمگر طاقتوں کے چنگل سے رہائی کے لئے جدوجہد ہے، اس طرح سے غلط تفسیر وتوجیہ کرے؟"[۲]

(ب) دین وسیاست

جدید دور میں یہ ایک اہم موضوع ہے کہ دین کا سیاست سے کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ یا دونوں ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں؟ اہل یورپ کی اکثریت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مذہب اور دین کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور دونوں کی حیثیت جداگانہ ہے۔ نیز کسی فرد کی زندگی میں مذہب اور دین اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ اسی لئے ان لوگوں نے سیاست سے دین یا مذہب کو بے دخل کر دیا ہے۔ اس کے برعکس

۱۔ مولانا محمد عمار خان ناصر اور مولانا محمد یحیٰ نعمانی نے اس نظریہ پر تفصیلی گفتگو ماہنامہ "الشریعہ" کے خصوصی شمارہ میں کی ہے، ملاحظہ ہو: ماہنامہ الشریعہ، خصوصی اشاعت، جہاد کلاسیکی وعصری تناظر میں، الشریعہ اکاڈمی، گوجرانوالہ، مارچ ۲۰۱۲ء، جلد ۲۳، شمارہ ۳

۲۔ اقامۂ نماز کمیٹی کے ارکان سے خطاب: ۱۸/ستمبر ۲۰۰۶ء

اسلام کہتا ہے کہ دین کا سیاست سے گہرا تعلق ہے اور دونوں کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ علامہ سید علی خامنہ ای درج بالا فکر پر نقد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"یہ صرف امریکی اسلام ہے جو لوگوں کو سیاست سے اور سیاسی عمل وفراست اور بحث و گفتگو سے دوری اختیار کرنے کی ہدایت و نصیحت کرتا ہے، تاہم خالص اسلام سیاست کو دین سے کبھی الگ نہ ہونے والا جز قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو سیاسی عمل وادراک کی دعوت دیتا ہے۔"[۱]

علامہ سید علی خامنہ ای کی نظر میں سیاست دین کا ایک ناگزیر حصہ ہے کیوں کہ اس کے بغیر دنیا میں امن وسکون قائم نہیں ہو سکتا ہے۔ ایسا اسی وقت ممکن ہوگا جب حکومت کی باگ ڈور دیندار اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے ہاتھوں میں ہوگی۔ انہوں نے اسے اسوۂ نبوی سے بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نبی کریمؐ نے مدینہ منورہ میں نہ صرف پر سکون اسلامی معاشرہ قائم کیا بلکہ اسلامی نظام حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ ایسا اس لئے ممکن ہو سکا تھا کہ آپؐ نے سیاست کو دین سے الگ نہیں سمجھا۔ آپ اس حوالے سے فرماتے ہیں:

"کچھ بے خبر لوگ دین وسیاست سے علیحدگی کے بارے میں باتیں کرتے ہیں، یعنی یہ کہ دین کو گوشۂ تنہائی میں ڈال دیں اور اس سلسلہ میں آدمی صرف نصیحت پر اکتفا کرے۔ یہاں پر نصیحت سے کام نہیں چلنے والا ہے۔ جو چیز طاقتوں کو لگام لگا سکتی ہے، اور ظلم وفساد وبد عنوانی کے خلاف استقامت دکھا کر ان کی جڑوں کو سکھا کر ان کا قلع قمع کرتے ہوئے خاتمہ کر سکتی ہے وہ الٰہی واسلامی طاقت واقتدار ہے، ایسی سیاسی طاقت جسے اسلامی احکام کے تحت اختیار ہونا چاہئے۔ امام زمانہ ارواحنا فداہ اپنے اعلیٰ قدر ایمان اور اپنے پیروکاروں نیز چاہنے والوں کے پختہ ایمان اور خداداد طاقت واقتدار کے ذریعہ عالمی ستمگروں کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ستم کے محل کو تباہ وبرباد کردیں گے۔"[۲]

۱۔ بیت اللہ الحرام کے حاجیوں کے نام پیغام: ۵/جولائی ۱۹۸۹ء

۲۔ پندرہ شعبان کے موقع پر تہران میں لوگوں کے اجتماع عظیم سے خطاب: ۲۲/اکتوبر ۲۰۰۲ء

موجودہ دور میں ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ خود مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے نے بھی سیاست کو دین کا حصہ نہیں مانا ہے۔ اس فکر کے حاملین کا ماننا ہے کہ اسلام کا سیاست سے زیادہ سے زیادہ رشتہ ثانوی حیثیت کا ہے اور دین میں اسے بنیادی درجہ نہیں دیا جاسکتا ہے، نیز حکومت کا قیام اور اس کے لئے کوشش کرنا اسلام کے ماننے والوں کی ذمہ داری نہیں ہے۔ علامہ سید علی خامنہ ای نے ایسے لوگوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے، چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

"دین کے دعویدار لوگ بھی یہی بات کہتے ہیں کہ دین سیاست سے علیحدہ ہے تو کیا ان لوگوں نے قرآنی آیتوں، تاریخ اسلام اور شریعت کے احکام پر غور وفکر کیا ہے؟ کیا ان لوگوں نے اس بارے میں سوچا ہے کہ اگر دین سیاست سے الگ ہے تو پھر قرآن نے سب ہی سیاسی امور، حکومت، قانون زندگی کے سبھی تانے بانے جنگ و صلح، دوست و دشمن کا تعیین اور دیگر سبھی سیاسی مظاہر کو خدا، دین خدا اور اولیائے خدا سے مرتبط و متعلق کیوں قرار دیا ہے؟"[۱]

ایسی فکر کے حاملین کو علامہ موصوف اسلام کا دشمن اور مال ودولت کا لٹیرا قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"دین سیاست سے علیحدہ نہیں ہے۔ یہ دین کے احکام، امور مملکت اور احکام سلطانیہ کا ایک حصہ ہے۔ فقہ میں، ابواب احکام سلطانیہ کے نام سے ایک باب ہے، بنابریں، احکام سلطانیہ بھی دین کا حصہ ہے، جو لوگ اس کو ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں وہ لوگ دین کے دشمن اور میدان سیاست کے لٹیرے ہیں۔"[۲]

علامہ سید علی خامنہ ای کی درج بالا رائے برصغیر کے معروف اسکالر اور محقق مولانا صدر الدین اصلاحی کے افکار و نظریات کے عین مطابق ہے جنہوں نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مختلف نکات سے

۱۔ بیت اللہ الحرام کے حاجیوں کے نام پیغام: ۵/جولائی ۱۹۸۹ء

۲۔ علمائے کرام اور حوزہ علمیہ کے اساتید کے گروہ سے خطاب: ۱۳۶۸، ۱۰، ۵ شمسی

ثابت کیا ہے کہ اسلام زندگی کا ایک ایسا مکمل نظام رکھتا ہے جس کا ایک حصہ سیاسی نظام بھی ہے۔[۱] وہ اس سلسلے میں حضرت کعب الاحبار کا ایک قول نقل کرتے ہیں:

مثل الاسلام والسلطان والناس مثل الفسطاط والعمود والاوتاد، فالفسطاط الاسلام والعمود السلطان والاوتاد الناس ولا یصلح بعضها الابعض۔[۲] ترجمہ: اسلام اور حکومت اور عوام الناس، ان تینوں کی مثال شامیانے اور اس کے کھمبے اور اس کے کھونٹوں جیسی ہے۔ شامیانہ اسلام ہے۔ کھمبا حکومت ہے اور کھونٹے عوام الناس ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی باقی دو کے بغیر اپنی ٹھیک حالت میں نہیں رہ سکتا۔

(ج) دینی عوامی حکومت

اگر موجودہ دور میں دنیا کے سیاسی نظاموں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح طور سے سامنے آتی ہے کہ "جمہوریت" یا "ڈیمو کریسی" کو اس میں نمایاں مقام حاصل ہے، جسے "مغربی جمہوریت" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ صرف ایک "انتظامی طریقہ کار" ہی نہیں ہے، بلکہ باقاعدہ ایک نظام، فلسفہ اور دین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا پرکشش نعرہ یہ ہے کہ یہاں کسی مخصوص طبقہ کو برتری نہیں ہے اور سب کو برابری کا درجہ حاصل ہے، نیز عوام کو اس نظام میں خصوصی مقام حاصل ہے۔ یہ اور اسی طرح کی بعض دیگر صفات سے متاثر ہو کر مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ بھی اس نظام کا قائل ہوتا جارہا ہے۔ اس فکر کے حاملین کا ماننا ہے کہ "مغربی جمہوریت" میں دین کو شامل کرکے اسے برائیوں اور کمیوں سے پاک کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

"اسلامی نظام حکومت" کی حیثیت "مغربی جمہوری نظام" سے بالکل جداگانہ ہے۔ اول الذکر کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے اور اس میں حکمران اعلیٰ، اللہ تعالیٰ بذات خود ہے، جب کہ ثانی الذکر نظام خود انسانوں کا بنایا

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مولانا صدر الدین اصلاحی، اسلام ایک نظر میں، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۶ء، باب پنجم: دین وسیاست

۲۔ العقد الفرید، حصہ اول

ہوا ہے اور حکمران اعلیٰ کے منصب پر انسان ہی فائز ہے۔ علامہ سید علی خامنہ ای نے اسی پہلو سے " مغربی جمہوری نظام " پر نقد کرتے ہوئے اس کے بالمقابل " دینی عوامی حکومت " کا نظریہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس میں عوام اور اس کی آراء کا کہیں زیادہ قدر و احترام کیا جاتا ہے، وہ اس حوالے سے فرماتے ہیں :

" اسلامی نظام میں عوامی دینی حکومت ہوتی ہے یعنی یہ اسلام کے نظریہ پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ صرف ایک رائج معاہدہ نہیں ہے ، عوام کی خواہشات و ارادے سے رجوع کرنا، جو کہ لازمی امر شمار ہوتا ہے اسلام کی رائے قرار پاتا ہے، اس لئے یہ اسلامی فرض اور ذمہ داری وجود میں لاتا ہے۔ اس نظام کی حقیقت یہ ہے کہ اسے الٰہی ہدایت اور عوامی ارادوں کے تحت چلایا جاتا ہے۔ دنیا کے نظاموں کی پریشانی یہ ہے کہ ان کے اندر الٰہی ہدایت کا فقدان ہے، مثال میں مغربی ڈیمو کریسی کا نام لیا جاسکتا ہے کہ جس میں ظاہری طور پر عوامی ارادہ تو پایا جاتا ہے تاہم الٰہی ہدایت کا فقدان ہے۔ "[۱]

(د) اسلامی تمدن و ثقافت

کسی بھی قوم کی ترقی و تنزلی میں اس کی تہذیب و تمدن اور ثقافت کا اہم کردار ہوا کرتا ہے۔ در حقیقت کسی قوم کے اخلاقی اقدار اور اصولوں کی بنیاد اس کا عقیدہ ، نظریۂ حیات اور تہذیب و ثقافت ہی ہوا کرتی ہے جس کے بدل جانے سے پورا نظریہ نظام اخلاق تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر موجودہ دور کے دو مشہور تمدن و ثقافت ، اسلامی تمدن و ثقافت اور مغربی تمدن و ثقافت کا جائزہ لیا جائے تو دونوں کے درمیان درج ذیل بنیادی فرق سامنے نظر آتا ہے:

اسلامی تہذیب و تمدن کی بنیاد " توحید " پر ہے۔ اس نظریہ کے مطابق کائنات میں پائی جانے والی اشیاء اور بذات خود انسان بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ اس لحاظ سے اس کی تمام تر صلاحیتیں رب العالمین کی عطا کردہ ہیں جنہیں وہ اس کی مقرر کردہ حدود و قیود کے اندر ہی استعمال کرسکتا ہے اور اس سلسلے میں وہ وحی الٰہی کا نہ صرف محتاج ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ بھی ہے۔ اس کے برعکس مغربی تہذیب و تمدن کی

۱۔ مرقد امام خمینیؒ پر موجود لوگوں سے خطاب: ۴/جون ۲۰۰۲ء شہر کاشان و آران و بید گل کے اجتماع عظیم سے خطاب: ۱۱/ نومبر ۲۰۰۱ء

بنیاد ” مادیت “ پر ہے۔ اس نظریہ کے مطابق انسان کسی بالاتر ہستی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔ اس کا ماننا ہے کہ اخلاقی اصول و قوانین در اصل سماج کے مصالح کے پیدا کردہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ دونوں نظریات ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف ہیں اس لئے دونوں کے نتیجے بھی مختلف ہوں گے۔

علامہ سید علی خامنہ ای نے ” اسلامی تمدن وثقافت “ کے تحت دونوں تہذیبوں کے مثبت اور منفی اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ وہ اسلامی تمدن وثقافت کی صفات اور خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسی کے ذریعہ کسی قوم کو سربلندی، خوش نصیبی، عزت واقتدار اور ترقی مل سکتی ہے۔ انہوں نے دلیل میں تاریخ سے حوالہ دیا ہے کہ ابتدا میں یورپ اسلامی تہذیب وتمدن کے سامنے دب گیا تھا اور یہ سلسلہ کئی صدیوں تک جاری رہا، نیز مغرب کی نشاۃ ثانیہ میں بھی اسلامی تمدن کا اہم کردار رہا ہے۔[۱] یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ نے شروع سے ہی اسلامی تمدن کو اپنا نشانہ بنایا اور اسے کمزور کرنے یا تباہ وبرباد کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس حوالے سے کہتے ہیں:

> ” سولہویں اور سترہویں صدی ہجری میں جب سے سامراج نے مشرق زمین خاص کر اسلامی سرزمینوں میں اپنے پیر پسارے ہیں، قوموں کو مکمل طور پر اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی خاطر انہیں اپنے ماضی، اپنی موجودہ ہستی، اپنے مذہب، آداب ورسوم یہاں تک کہ اپنے پہناوے کے بارے میں بھی بدگمانی پھیلانا شروع کر دیا۔ یہ سب عبرت آمیز چیزیں ہیں۔ “[۲]

علامہ خامنہ ای نے ساتھ ہی مغربی تمدن سے بچنے اور اسلامی تمدن وثقافت کے فروغ کے طریقہ کار پر بھی گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ اس کے لئے ضروری ہے کہ ملک میں اسلامی نظام حکومت قائم ہو۔ نیز وہ دنیا میں شر وفساد، بدعنوانی، فحاشی اور عریانی کا سبب مغربی تمدن وثقافت کو ٹھہراتے ہوئے کہتے ہیں:

> ” مغربی ثقافت، انسانوں کی بربادی کے لئے مرتب شدہ پروگرام کا حصہ ہے، یہ بغض وحسد اور دشمنی نیز انسانی فضیلت واقدار سے دشمنی کی ثقافت ہے۔ اس ثقافت کے

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: کلام رہنما، علی خالق پور، ایران کلچر ہاؤس، ۱۸۔ تلک مارگ، نئی دہلی، بار اول، ۲۰۱۵ء صفحہ ۲۹۷

۲۔ کردستانی عوام سے خطاب: ۱۲/ مئی ۲۰۰۹ء

ذریعہ کوشش کی جارہی ہے کہ بنی نوع انسانی کی تمام نسلوں کو سبھی انسانی فضیلتوں سے خالی کرکے فاسد و مطیع اور یاد خدا اور معنویت سے غافل انسانوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ یہ ثقافت عورت اور مردوں کے درمیان بے قید و شرط ملاپ، مخلوط معاشرت اور عریانیت کے قرین ہے جو کہ مغربی ثقافت کے بنیادی ترین ارکان میں سے ہے۔"[1]

البتہ اس سلسلے میں علامہ موصوف کے نظریات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کلیتاً مغربی تہذیب و ثقافت کے خلاف نہیں ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اس میں جہاں نقصانات ہیں وہیں بعض مثبت چیزیں بھی ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ ہاں، مسلمانوں کو اس کے مضر اثرات سے واقف رہنا چاہئے۔ مزید برآں وہ اس بات پر خصوصی زور دیتے ہیں کہ کوئی قوم دوسروں پر اپنی تہذیب و تمدن اور ثقافت کو زبردستی تھوپنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ اس حوالے سے فرماتے ہیں:

"اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ کون سی ثقافت صحیح ہے اور کون سی غلط ہے، ہر قوم کو اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے ہوئے اپنے عقائد و آداب اور عادتوں کے منتخب کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی دوسری طاقت کو یہ حق اور اختیار حاصل نہیں ہے کہ کسی قوم کو یہ کہے کہ تم لوگ ایسا سلوک کیوں کرتے ہو اور ایسا کیوں نہیں کرتے ہو؟ یہ غلط بات ہے۔"[2]

بہر حال حضرت علامہ سید علی خامنہ ای کی حیات وخدمات اور ان کے افکار و نظریات کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اسلامی فکر کی تشریح اور اس کو وسعت و گہرائی عطا کرنے میں حیات مستعار کا گراں قدر حصہ صرف کرکے اپنی ذمہ داری ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

۱۔ ڈاکٹروں کے اجتماع سے خطاب: ۶/دسمبر ۱۹۸۹

۲۔ مختلف طبقات پر مشتمل لوگوں سے خطاب: ۲۳/مارچ ۱۹۹۵ء